



دوقومی نظریہ

مکتبہ اربعی

مُرتب

محمد عبدالحکیم شرف قادری

حضرت مجدد الف ثانی
اور
علامہ اقبال کی نظریں

رضا اکیڈمی ریسرچ لائبریری

ریاستہائے پاکستان

دوقومی نظام

حضرت مجدد الف ثانی اور علامہ اقبال
کی نظروں

ترتیب

محمد عبدالحکیم شریف قادری

رضا الہی کی دینی، لاہور

بسم الله الرحمن الرحيم

امام ربانی اور دو قومی نظریہ

محمد عبد الحکیم شرف قادری

نام کتاب — دو قومی نظریہ، حضرت مجدد الف ثانی

اور علامہ اقبال کی نظریں

ترتیب — محمد عبد الحکیم شرف قادری

تاریخ اشاعت — ربيع الاول ۱۴۱۸ھ اگست ۱۹۹۷ء

صفحات — ۲۲

ناشر — رضا اکیڈمی

مطبع — احمد تہا آرٹ پریس، مونی روڈ لاہور

یہ — دُعائے خیر بحق، مازینِ رضا اکیڈمی رجز لاہور

عطیات بھیجنے کے لیے رضا اکیڈمی

اکاؤنٹ نمبر ۳۸/۹۳۸، حبیب بینک - دکن پورہ برانچ ۰ لاہور

بدیہ ڈاک طلب کرنے والے حضرات ۱۰ روپے کے ڈاک منٹ آرسل کریں۔

میلنے کا پتہ

رضا اکیڈمی رجز مسجد رضا محبوب روڈ، پامیران، لاہور پاکستان

کوڈ نمبر ۵۳۹۰۰، فون نمبر ۷۵۵۰۳۳

• نحمدہ ونصلی و سلم علی رسولہ الکریم و علی آلہ واصحابہ اجمعین۔

جناب صدر گرامی قدر! حضرت حاجی پیر صاحب مدظلہ العالی اور سامعین کرام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میرے مقالے کا موضوع ہے:

”امام ربانی اور دو قومی نظریہ“

میرے لئے یہ امر باعث سعادت ہے کہ مجھے اس عنوان پر گفتگو کی اجازت دی

گئی ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔

ان اللہ عز و جل بیعت لہذہ الامۃ علی راس کل مانہ سنہ من یجدلہا

دینہا (مشکوٰۃ شریف ص ۳۶)

بے شک اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر صدی کے آخر میں ایسی ہستی بھیجے گا

جو اس کے دین کو نکھار کر پیش کرے گی۔

مگر دش زمانہ کے ساتھ افکار و نظریات میں تبدیلی آ جاتی ہے، عقائد، اعمال اور

احوال کے مسائل دھندلا جاتے ہیں جب کہ دین اسلام لافانی دین ہے، اس کی

حفاظت رب العالمین جل شانہ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور حضور سید عالم خاتم

الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیہم و سلم پر سلسلہ نبوت ختم ہو چکا ہے۔ آپ کے

بعد کوئی نیامی نہیں آئے گا، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے دین کی حفاظت کا

یہ انتظام فرمایا کہ ہر صدی میں ایسے جلیل القدر اصحاب ایمان پیدا فرمائے جو نبی تو

نہیں تھے لیکن وارثان انبیاء تھے، انہوں نے حق اور ناحق کو جدا کیا، سنت و بدعت میں فرق کیا، ایمان کی محبت و عظمت دلوں میں بٹھائی، کفر سے نفرت کا درس دیا، فسق و فجور میں ڈوبے ہوئے افراد کو تقویٰ و طہارت کا پیکر بنا دیا، جہالت اور غفلت کی مدہوشی میں غرق شدہ لوگوں کو خود شناس، خدا پرست اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات اور سنتوں کا عامل بنا دیا۔ مختصر یہ کہ انسان نما حیوانوں کو مقام انسانیت پر فائز کر دیا۔

امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہ العزیز بھی سلسلہ مجددین کی سنہری کڑی ہیں اور آپ کا امتیازی وصف یہ ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دنیا سے رحلت فرما جانے کے ایک ہزار سال بعد آپ نے تجدیدِ دین کا کارنامہ انجام دیا اور اس طویل عرصے میں اپنوں کی بے اعتنائی اور بیگانوں کی چہرہ دستی نے گرد و غبار اور شکوک و شبہات کی جو دہیز دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں انہیں مسمار کر کے دینِ متین کا رخ زیباسب کے سامنے بے حجاب کر دیا۔

امام ربانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا سلسلہ نسب ۲۹ واسطوں سے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ ۹۷۱ھ میں آپ کی ولادت باسعادت سرہند شریف میں ہوئی، آپ کے والد گرامی شیخ عبدالاحد رحمہ اللہ تعالیٰ کو حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے صاحبزادے حضرت شیخ رکن الدین سے سلسلہ قادریہ چشتیہ میں اجازت و خلافت حاصل تھی۔

امام ربانی نے اکثر و بیشتر علوم اپنے والد ماجد سے حاصل کئے، ان کے علاوہ مولانا کمال الدین کشمیری، مولانا یعقوب کشمیری اور قاضی بہلول بدخشی سے بھی علوم عقلیہ و نقلیہ حاصل کئے۔ قلعہ گوالیار کی اسیری کے دور (۲۹ - ۱۰۲۸ھ) میں قرآن پال منظر کیا۔

حضرت مجدد الف ثانی کو سلسلہ چشتیہ میں اپنے والد ماجد سے اور سلسلہ قادریہ میں حضرت شاہ کمال کیتھلی سے اجازت و خلافت تھی۔ ۱۰۰۸ھ میں حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت ہو کر سلسلہ نقشبندیہ میں اجازت و خلافت حاصل کی (۱) اور آسمان ولایت کے آفتاب و مابہتاب بن کر چمکے، آپ نے اتباعِ شریعت و سنت کی ایسی تحریک چلائی جس کے اثرات صرف ہندوستان کے گوشے گوشے میں نہیں بلکہ وسط ایشیاء، شام اور دیگر ممالک تک پہنچے۔

امام ربانی کی مساعی جلیلہ کی بدولت دنیائے اسلام میں نئی بہار آگئی، اتباعِ شریعت کا چلن عام ہوا، ان کی توجہات عالیہ سے صرف ظاہری تبدیلی نہیں آئی بلکہ دلوں کی دنیا میں انقلاب آگیا، کافر حلقہ بگوش اسلام ہوئے، فاسق و فاجر عابدِ شب زندہ دار بن گئے اور خوش بخت حضرات ولایت علیا کے مقام پر فائز ہو گئے، دینی مدارس سے قال اللہ، قال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند ہونے لگیں، مسجدیں اور خانقاہیں عبادت و ریاضت اور ذکر و فکر سے آباد ہو گئیں۔ لطیفہ 'قلب'، 'روح'، 'سر'، 'خفی'، 'اخفی'، نفسی اور قلبی ذکر الہی سے معمور ہو گئے، نفی و اثبات اور مراقبات کا دور دورہ ہوا، اخلاص و احسان کے مظاہرے عام ہو گئے، یہ سب اس قدسی صفات ہستی کا فیض نظر تھا جسے دنیا امام ربانی، مجدد الف ثانی کے القاب سے جانتی اور پہچانتی ہے۔

دو قومی نظریہ

اس نظریے کے فروغ کے لئے امام ربانی قدس سرہ کی مساعی جلیلہ کے بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس دور کا مختصر جائزہ پیش کر دیا جائے تاکہ آپ کی مجاہدانہ کارروائی کی قدر و قیمت کا کسی حد تک اندازہ ہو سکے۔ آپ کی مصالحانہ کوششوں کا آغاز اکبر کے دور میں ہوا اور جہانگیر کے دور میں ان کوششوں کے ثمرات لوگوں نے سر کی آنکھوں سے دیکھ لئے۔

اکبر بادشاہ زندگی کے ابتدائی دور میں مخلص مسلمان دکھائی دیتا تھا، باقاعدہ نماز، ہنگامہ ادا کرتا، علماء دین کا احترام کرتا یہاں تک کہ بعض علماء کی جوتیاں خود سیدھی کرتا، رفتہ رفتہ اس میں تبدیلیاں آنے لگیں اور وہ دین سے دور ہوتا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود علم سے بے بہرہ تھا، اس کے حرم شاہی میں ہندو خواتین شامل تھیں، اس کے دربار میں ہندوؤں کی قدر و منزلت تھی، عیسائی پادریوں سے میل ملاپ تھا اور اس کے ارد گرد ایسے علماء سوء جمع ہو گئے تھے جن کا مسلح نظر بادشاہ کی خوشنودی اور مال دنیا حاصل کرنے کے علاوہ کچھ نہ تھا، وہ بھرے دربار میں اس طرح ایک دوسرے سے دست بکریاں ہوتے کہ بادشاہ علماء سے تو کیا اسلام ہی سے بد دل ہوتا گیا، ان تمام عوامل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نے ایک نئے دین ”دین الہی“ کی داغ بیل ڈال دی۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد مدظلہ اس دور کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”تیسرے دور میں دین الہی کا آغاز ہوا اور وہ کچھ ہوا جو ناگفتنی ہے، ہر وہ کام کیا جانے لگا جو اسلام کے سراسر منافی ہے، مثلاً ”کلمہ طیبہ میں ”محمد رسول اللہ“ کی جگہ ”اکبر خلیفۃ اللہ“ پڑھا جانے لگا، گائے کی قربانی پر پابندی لگا دی گئی، خنزیر اور کتوں کا احترام ہونے لگا، شراب اور جوام عام ہو گیا، اکبر نے علماء کو بالجبر شراب پلائی، عورتوں کی بے حجابی عام ہو گئی، پردہ پر پابندی لگا دی گئی، زمین بوس کے نام سے سجدہ کا آغاز کیا گیا، عالم و عوامی سب بادشاہ کے آگے سجدہ ریز ہونے لگے، بعض مساجد ڈھا دی گئیں اور مدارس عربیہ مسمار کر دیئے گئے، داڑھیاں منڈوا دی گئیں اور شعائر اسلام کا ہر سرعام مذاق اڑایا جانے لگا“ (۲)۔

اندازہ فرمائیں ایسے پر آشوب دور میں کلمہ حق کہنا اور پرچم اسلام بلند کرنا کتنا مشکل ہوگا؟ جب علم سے بے بہرہ اور خود سر حکمران، مخالف اسلام فتنے کا خود بانی ہو، ابو الفضل اور فیضی جیسے علماء اس کے خوشامدی ہوں، مشائخ منقار زیر پر ہوں،

ایسے عالم میں شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی اپنی تصانیف کے ذریعے اور امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہما اللہ تعالیٰ اپنے مکتوبات کے ذریعے عوام، علماء، صوفیا اور بادشاہ وقت کے مقربین کو اسلام کی حفاظت اور سرہندی کے لئے کام کرنے کی دعوت دیتے ہوئے میدان عمل میں سرکھٹ دکھائی دیتے ہیں۔

آج ذرائع ابلاغ اتنے تیز ہیں کہ ”آنا“ ”فانا“ ایک پیغام مشرق سے مغرب تک پہنچ جاتا ہے، امام ربانی کے دور میں اخبارات، ٹیلیوژن اور سیٹلائٹ کا وجود نہیں تھا، اس کے باوجود آپ نے مکتوبات کے ذریعے اسلام کا پیغام مریدین، خلفاء اور ارکان سلطنت تک پہنچایا۔ آپ کے مکتوبات ذاتی نوعیت کے نہیں تھے بلکہ ہر مکتوب میں دین کا پیغام اور شریعت و طریقت کا کوئی مسئلہ بیان کیا جاتا تھا، جس کے نام مکتوب ارسال کیا جاتا وہ اسے اپنی ذات تک محدود نہ رکھتا بلکہ اصل یا اس کی نقل دوسروں تک پہنچا دیتا اس طرح وہ مکتوب تیزی کے ساتھ دور دراز تک پہنچ جاتا۔ ایک دلی کامل و مکمل کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ پڑھنے سننے والوں کے دل و دماغ میں اتر جاتا اور انقلاب برپا کر دیتا۔

حضرت امام ربانی نے دین کی جن بنیادی تعلیمات پر بطور خاص زور دیا ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسلام اور کفر ایک دوسرے کی ضدیں ہیں۔ ان کا آپس میں نہ تو اتحاد ہو سکتا ہے اور نہ ہی مفاہمت ہو سکتی ہے، اسلام لانے کا صرف یہ مطلب نہیں کہ زبان سے کلمہ طیبہ پڑھ لیا جائے اور دل سے تصدیق کر لی جائے، مسلمان بننے کے لئے تصدیق اور اقرار کے بعد احکام اسلام پر عمل کرنا اور اپنی طاقت کے مطابق اسلام کی ترویج و اشاعت کے لئے کوشش کرنا بھی ضروری ہے، اس کے ساتھ ہی کفر، معصیت اور کافر سے نفرت و بیزاری اور کفر کے مٹانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا بھی ضروری ہے، ایک مسلمان کے لئے کفر اور کافر کی محبت و تعظیم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

ولكن الله حبيب اليكم الايمان و زينته في قلوبكم و كره اليكم الكفر و
الفسوق و العصيان (۷/۴۹) لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارے لئے محبوب بنا دیا
اور اسے تمہارے دلوں میں مزین کر دیا اور تمہارے لئے کفر، فسق اور معصیت کو
مکروہ بنا دیا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

يا ايها الذين امنوا لا تتخذوا اليهود و النصارى اولياء بعضهم اولياء
بعض و من يتولهم منهم فانه منكم (۵/۵۱)

اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں،
تم میں سے جو ان سے دوستی رکھے گا وہ ان میں سے ہوگا۔

اللہ اکبر! کتنا پر جلال ارشاد ہے جسے سن کر ایک مسلمان پر کچکی طاری ہو
جائے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جس شخص میں تین خصلتیں پائی جائیں ان کے
ذریعے وہ ایمان کی حلاوت (مٹھاس) پالے گا۔

۱۔ جس شخص کے نزدیک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ
وسلم ہر ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں۔

۲۔ جو کسی بندے سے محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے محبت رکھے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کفر سے نجات دی ہے تو وہ کفر کی طرف لوٹ جانے کو
اس طرح مکروہ جانے جس طرح آگ میں ڈالے جانے کو مکروہ جانتا ہے۔ (۳)

امام ربانی نے اپنے مکتوبات میں بڑے درد و سوز کے ساتھ اسلام کی سر بلندی اور
کفر کے ذلیل کرنے کی اپیل کی ہے، خان اعظم کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

”اسلام کی غیبت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ کفار برملا اسلام پر طعن اور
مسلمانوں کی مذمت کرتے ہیں، کفر کے احکام بے تحاشا جاری کرتے ہیں اور گلی
کوبوں میں اہل کفر کی تعریفیں کرتے ہیں، مسلمانوں کو اجرائے احکام سے روکا جاتا

ہے اور احکام اسلام بجالانے پر اعتراض کیا جاتا ہے۔۔۔ آپ کو شش فرمائیں کہ
کم از کم کافروں کے بڑے بڑے احکام جو مسلمانوں میں عام ہو رہے ہیں وہ ختم ہو
جائیں اور مسلمان ان مخالف شریعت کاموں سے محفوظ ہو جائیں۔۔۔ گزشتہ
حکومت (اکبر کے دور) میں دین مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دشمنی مترشح
ہوتی تھی، اس حکومت میں ظاہراً وہ عناد نہیں ہے اور اگر ہے تو بے علمی کی بنا پر
ہے، خوف اس بات کا ہے کہ کہیں اس جگہ بھی معاملہ دشمنی تک نہ پہنچ جائے
اور مسلمانوں کے لئے معاملہ (زندگی گزارنا) مشکل ہو جائے“ (۴)۔

ایک دوسرے مکتوب میں جناب سید شیخ فرید کو تحریر فرماتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے کلام مجید میں کافروں کو اپنا اور اپنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ
وسلم کا دشمن فرمایا ہے، لہذا خدا اور رسول کے ان دشمنوں کے ساتھ دوستی اور
میل جول بڑا گناہ ہوگا، ان دشمنوں کی ہم نشینی اور ان سے میل ملاپ کا کم سے کم
نقصان یہ ہے کہ احکام شریعت کے جاری کرنے اور کفر کے نشانات کے مٹانے کی
قوت کمزور پڑ جائے گی اور دوستی کا تعلق اس میں رکاوٹ بنے گا اور یہ بہت بڑا
نقصان ہے۔“

اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کی دوستی اور محبت، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنی تک پہنچنے کا ذریعہ بن جائے گی۔ ایک شخص یہ گمان
کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
پر ایمان رکھتا ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ اس قسم کے قبیح اعمال، اس کی دولت ایمان
کا صفایا کر دیں گے، ان ناکارہ لوگوں کا کام اسلام اور مسلمانوں کا تمسخر اڑانا ہے، وہ
اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ اگر ان کا بس چلے تو مسلمانوں کو تباہ کر دیں یا سب
کو قتل کر دیں یا انہیں کافر بنا لیں۔ پس اہل اسلام کو بھی شرم کرنی چاہئے کہ
”الحیاء من الایمان“ (حیاء ایمان کے اعمال میں سے ہے) مسلمان ہونے کی

لاج رکھنی چاہئے اور ہمیشہ ان کو ذلیل کرتے رہنا چاہئے" (۵)۔

اس موضوع پر امام ربانی کا جو مکتوب بھی پڑھیں اس کے ایک ایک جملے سے جلال فاروقی جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بندہ مومن کو سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہونی چاہئے، تب ہی اسے ایمان کی چاشنی میسر آسکے گی (جیسے کہ اس سے پہلے حدیث شریف کے حوالے سے بیان ہوا) اب آپ خود ہی سوچئے کہ جس ہستی کے ساتھ ایمان کی حد تک محبت ہو، کیا اس کے دشمن سے محبت ہو سکتی ہے؟ اس کی تعظیم کی جاسکتی ہے، اس کی عزت افزائی کی جاسکتی؟ حاشا دکلا! اگر ایسا کیا گیا تو یہ محبت کی توہین ہوگی اور غیرت ایمانی کے سراسر منافی۔

یہ ہے دو قوی نظریہ جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے، جسے اکبری دور میں ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو اللہ تعالیٰ کی نصرت و توفیق سے امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز نے جرات ایمانی اور جلال فاروقی سے کام لیتے ہوئے ایسی کوششوں کو خاک میں ملا دیا۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے بجا کہا ہے:

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان

اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

حضرت امام ربانی نے پرچم اسلام بلند کرنے کے لئے جو کوششیں کیں ان کی کامیابی اور نتائج کا تذکرہ کرتے ہوئے، پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد مدظلہ لکھتے ہیں:

"حضرت مجدد نے اسلام کے لئے اپنا تن، من، دھن سب کچھ لٹا دیا۔ عزیمت پسندی کی ایسی شاندار مثالیں قائم کیں جن سے مردہ دل زندہ ہو گئے اور ایک عظیم انقلاب آگیا۔۔۔۔۔ بادشاہ کے حضور سجدہ تعظیمی (زمین بوس) موقوف کر دیا گیا، گائے کی قربانی عام ہو گئی اور سب سے پہلے خود جہانگیر نے قلعہ کاگڑا میں حضرت مجدد کی موجودگی میں گائے ذبح کرائی، شراب پر پابندی لگا دی گئی اور بے شمار

اصلاحات ہوئیں۔ بلاشبہ حضرت مجدد کی انتھک جدوجہد سے مذہبی سطح پر اسلام، منہیت اور حنفیت کو فروغ ہوا۔۔۔۔۔ سیاسی سطح پر اسلامی حکومت کا قیام ممکن ہوا۔۔۔۔۔ روحانی سطح پر تصور وحدۃ الوجود کی غلط تعبیرات سے جو ہلاکت پھیل رہی تھی تصور وحدۃ الشہود نے اس کا موثر دفاع کیا اور ناقابل فہم کو عام لوگوں کے لئے قابل فہم بنا دیا گیا۔۔۔۔۔ اس طرح ہر سطح پر فکر مسلم کی اصلاح کر کے ایک عظیم انقلاب برپا کیا گیا" (۶)۔

مشہور مورخ اور محقق، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں:

"جہانگیر کے دور حکومت میں شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی آگے آئے، آپ کی مسلسل کوششوں سے تحریک احیائے دین کا آغاز ہوا، چنانچہ اس انقلاب و تبدیلی کے نتیجے میں سیاسی سطح پر جو کوششیں کی گئیں وہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے درباروں کی بدلتی فضا میں مطالعہ کی جاسکتی ہیں، اکبر بادشاہ آزاد خیالی اور اتحاد کا نقطہء عروج تھا، جہانگیر کی تخت نشینی سے اس آزاد خیالی کا زوال شروع ہوتا ہے، شاہجہاں اگرچہ پارسا سنی مسلمان تھا اور دربار میں کسی قسم کی مذہبی ڈھیل برداشت نہیں کرتا تھا، تاہم اس نے غیر سنیوں کو بھی مطمئن رکھا، اورنگ زیب عالمگیر سنیوں کا نشان نصرت تھا" (۷)۔

اکبری دور کے بعد بیسویں صدی عیسوی کی ابتداء میں پھر اس فتنے نے سر اٹھایا، ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ بلند کیا گیا، کانگریسی علماء اس تحریک کے ہمراہ تھے، امام احمد رضا بریلوی نے علالت کے باوجود "المحجۃ المومنین" لکھ کر ہندو مسلم اتحاد کے تار و پود بکھیر دیئے اور قرآن و حدیث کے دلائل قاہرہ کی روشنی میں دو قومی نظریہ پوری قوت کے ساتھ پیش کیا۔

کس درد مندی کے ساتھ فرماتے ہیں:

"جب ہندوؤں کی غلامی ٹھہری، پھر کہاں کی غیرت اور کہاں کی خود داری؟۔۔۔

یہ مقالہ ۲۸ صفر ۱۵ جولائی ۱۳۱۷ھ / ۱۹۹۶ء کو ادارہ منظر علم کی طرف سے منعقد
امام ربانی کانفرنس، الحمراء ہال میں پڑھا گیا۔

حوالہ جات

- (۱) محمد مسعود احمد پروفیسر۔ مقدمہ تجلیات امام ربانی (مکتبہ نبویہ، لاہور) ص ۱۳ - ۱۳
- (۲) محمد مسعود احمد پروفیسر۔ مقدمہ تجلیات امام ربانی ص ۱۵
- (۳) محمد بن عبد اللہ الخلیفہ دلی الدین۔ مشکوٰۃ شریف علی (طبع کراچی) ص ۱۲
- (۴) احمد سرہندی، امام ربانی شیخ۔ مکتوبات امام ربانی، فارسی دفتر اول مکتوب ۶۵ ص ۵۳
- (۵) احمد سرہندی، مجدد الف ثانی، شیخ۔ مکتوبات امام ربانی، دفتر اول مکتوب ۲۳ ص ۵۲ - ۵۱
- (۶) محمد مسعود احمد، ڈاکٹر۔ مقدمہ تجلیات امام ربانی ص ۲۳ - ۲۳
- (۷) ایضاً ص ۲۸ - ۲۹
- (۸) احمد رضا بریلوی، امام۔ المجدد المومنین (طبع بریلی) ص ۸۳
- (۹) عبد الواحد معینی، سید۔ مقالات اقبال (آئینہ ادب، لاہور) ص ۲۷۸

ماخوذ از مقالات اقبال

مرتبہ سید عبدالواحد ص ۲۹۲

جغرافیائی حدود اور مسلمان

میں نے اپنے مصلح

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است

میں لفظ "ملت" قوم کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی میں
یہ لفظ اور بالخصوص قرآن مجید میں "شرع" اور "دین" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن
حال کی عربی نارسائی اور ترکی زبانوں میں بکثرت سنات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے
کہ ملت قوم کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ میں نے اپنی تحریروں میں بالعموم ملت
معنی قوم ہی استعمال کیا ہے لیکن چونکہ لفظ ملت کے معنی زیر بحث مسائل پر چنداں
نہیں۔ اس واسطے اس بحث میں پڑے بغیر ہی تسلیم کرتا ہوں کہ مولانا حسین احمد کا
ارشاد یہ تھا کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں۔

فرنگی نظریہ وطنیت

مجھ کو حقیقت میں مولانا کے اس ارشاد پر بھی اعتراض نہیں۔ اعتراض کی

گنجائش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب یہ کہا جائے کہ زمانہ حال میں اقوام کی تشکیل
 اوطان سے ہوتی ہے اور ہندی مسلمانوں کو مشورہ دیا جائے کہ وہ اس نظریہ کو اختیار کریں
 ایسے مشورہ سے قومیت کا جدید فرنگی نظریہ ہمارے سامنے آتا ہے جس کا ایک اہم
 دینی پہلو ہے جس کی تنقید ایک مسلمان کے لئے از بس ضروری ہے۔ افسوس ہے کہ
 میرے اعتراض سے مولانا کو یہ شبہ ہوا کہ مجھے کسی سیاسی جماعت کا پروپیگنڈہ
 مقصود ہے۔ عاशा وکلا میں نظریہ وطنیت کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں جب
 کہ دنیا سے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا۔ مجھ کو یورپی
 مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی
 ملک کا نہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے
 کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریہ وطنیت کا
 اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگ عظیم میں کامیاب بھی ہو گئی اور
 اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے
 حامی نظر آتے ہیں۔ زمانہ کا الٹ پھیر بھی عجیب ہے۔ ایک وقت تھا کہ نیم مغرب
 پڑھے لکھے مسلمان تفریح میں گرفتار تھے، اب علما اس لعنت میں گرفتار ہیں۔ شاید
 یورپ کے جدید نظریے ان کے لئے جاذب نظر ہیں۔ مگر افسوس ہے۔

نہ گرو کعبہ راخت حیات گرز آفرنگ آیدش لات و نجات

سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مولانا کا یہ ارشاد کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں

اقوام اعتراض نہیں۔ اس لئے کہ قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام
 کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیونکہ ہم
 سب کرۂ ارضی کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے
 علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا
 ہے محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں
 ہوتا۔ اس کے حدود آج کچھ ہیں اور کل کچھ۔ کل تک اہل برما ہندوستانی تھے اور آج
 برمی ہیں۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے
 اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔ بعض نادان لوگ
 اس کی تائید کرتے ہیں حسب الوطنی منہ الایمان کے موقوفہ حدیث سمجھ کر پیش
 کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری
 جذبہ ہے جس کی پرورش کے لئے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں۔ مگر زمانہ حال کے سیاسی
 لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول ہے، حیثیت اجتماعیہ
 انسانیت کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی حیثیت
 اجتماعیہ انسانیت کا ایک قانون ہے، اس لئے جب لفظ وطن کو ایک سیاسی تصور
 کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔

اسلام اور حیثیت اجتماعیہ انسانیت

مولانا حسین احمد صاحب سے بہتر اس بات کو کون جانتا ہے کہ اسلام
 حیثیت اجتماعیہ انسانیت کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے

کو تیار نہیں۔ بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نا معقول و مردود ہے۔ اس کلیہ سے بعض سیاسی مباحث پیدا ہوتے ہیں جن کا ہندوستان سے خاص تعلق ہے۔ مثلاً یہ کہ کیا مسلمان اور قوموں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے، یا ہندوستان کی مختلف قومیں ملکی اغراض کے لئے متحد نہیں ہو سکتیں وغیرہ وغیرہ لیکن چونکہ میرا مقصد اس وقت صرف مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے قول کے دینی پہلو کی تنقید ہے اس لئے میں ان مباحث کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہوں۔

اسلام واحد جماعتی نظام ہے

اسلام کے مذکورہ بالا دعوے پر عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے اول یہ کہ اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی حیثیتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں، بلکہ عام بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدبیر بھی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہد و عاقل ہے کہ قدیم زمانہ میں دین قومی تھا، جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے جس سے بد بخت یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ دین چونکہ پرائیویٹ عقائد کا نام ہے اس واسطے انسانوں

کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف سٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی ہے، نہ انفرادی نہ پرائیویٹ، بلکہ خالصتاً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم اور نسل پر بنا نہیں کیا جاسکتا نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جاسکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالم انسان کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ جو ایک مدت کی تشکیل اور اس کے بقا کے لئے ضروری ہے۔ کیا خوب کہا ہے مولانا رومیؒ نے۔

ہم دلی از ہم زبانی بہت راست

مسلمانوں کو ہر وقت تنبیہ

اس سے علیحدہ رہ کر جو اور راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی ہوگی اور شرف انسانی کے خلاف ہوگی اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہو گئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسا اساس نہ بن سکتی تھی۔ انہوں نے یہ اساس وطن کے تصور میں تلاش کی۔ کیا انجام ہوا اور ہو رہا ہے ان کے اس انتخاب کا؟ تو فکر کی اصلاح غیر سلیم عقلیت کا دورہ اصول دین کا اسٹیٹ کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ، یہ تمام قوتیں یورپ کو دھکیل کر کس طرف لے گئیں؟ لادینی ادھریت، اور اقتصادی جنگوں کی طرف۔ کیا مولانا حسین احمد یہ چاہتے ہیں کہ ایشیا میں بھی اسی تجربہ کا اعادہ ہو؟ مولوی صاحب زمانہ حال

میں قوم کے لئے وطن کی اساس ضروری سمجھتے ہیں۔ بیشک زمانہ حال نے اس اساس کو ضروری سمجھا ہے مگر صاف ظاہر ہے کہ یہ کافی نہیں بلکہ بہت سی اور قوتیں بھی ہیں جو اس قسم کی تشکیل کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً دین کی طرف سے بے پروائی، سیاسی روزمرہ مسائل میں انہماک اور عملی ہذا انقیاس اور دیگر موثرات جن کو ماہرین اپنے فہم سے پیدا کریں تاکہ ان ذرائع سے اس قوم میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ مولوی صاحب اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اگر ایسی قوم میں مختلف ادیان و مل بھی ہوں تو رفتہ رفتہ وہ تمام ملتیں مرٹ جاتی ہیں اور صرف لادینی اس قوم کے افراد میں وجہ اشتراک رہ جاتی ہے۔ کوئی دینی پیشوا تو کیا، ایک عام آدمی بھی جو دین کو انسانی زندگی کے لئے ضروری جانتا ہے، نہیں چاہتا کہ ہندوستان میں ایسی صورت حال پیدا ہو۔ باقی رہے مسلمان سوائسوں ہے کہ ان سادہ لوحوں کو اس نظریہ وطنیت کے لوازم اور عواقب کی پوری حقیقت معلوم نہیں۔ اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یک جا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہو گا اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی۔

مولانا حسین احمد کا نظریہ وطن

مگر جو فتنہ مولانا حسین احمد کے ارشاد میں پوشیدہ ہے وہ زیادہ وقت نظر کا محتاج ہے۔ اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ قارئین مندرجہ ذیل سطور کو غور سے

پڑھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔ مولانا حسین احمد عالم دین ہیں اور جو نظریہ انہوں نے قوم کے سامنے پیش کیا ہے۔ امت محمدیہ کے لئے اس کے خطرناک عواقب سے وہ بے خبر نہیں ہو سکتے، انہوں نے لفظ قوم استعمال کیا یا لفظ ملت؟ ہر اس لفظ سے اس جماعت کو تعبیر کرنا، جو ان کے تصور میں امت محمدیہ ہے اور اس کی اسکا وطن قرار دینا ایک نہایت دل شکن اور افسوسناک امر ہے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس تو ہوا۔ لیکن یہ احساس ان کو غلطی کے اعتراف یا اس کی تلافی کی طرف نہیں لے گیا۔ انہوں نے غلطی اور لغوی تاویل سے کام لے کر عذر گناہ بدتر از گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ ملت اور قوم کے لغوی فرق و امتیاز سے کیا تسلی ہو سکتی ہے۔ ملت کو قوم سے ممتاز قرار دینا ان لوگوں کی تشفی کا باعث تو ہو سکے، جو دین اسلام کے حقائق سے ناواقف ہیں، واقف کار لوگوں کو یہ قول دھوکا نہیں دے سکتا۔

وخطرناک نظریے

آپ نے سوچا نہیں کہ آپ اس توضیح سے دو غلط اور خطرناک نظریے مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

ایک یہ کہ مسلمان بحیثیت قوم اور ہو سکتے ہیں اور بحیثیت ملت اور۔ دوسرا یہ کہ از روئے قوم چونکہ وہ ہندوستانی ہیں، اس لئے مذہب کو علیحدہ چھوڑ کر انہیں باقی اقوام ہند کی قومیت یا ہندوستانیہ میں جذب ہونا چاہئے۔ یہ صرف قوم اور ملت کے الفاظ کا فرق ہے در نہ نظریہ وہی ہے جس

کہ اُپر ذکر ہوا اور جس کے اختیار کئی کے لئے اس ملک کی اکثریت اور اس کے رہنے
آئے دن یہاں کے مسلمانوں کو ملحقین کرتے رہتے ہیں۔

یعنی یہ کہ مذہب اور سیاست جدا چیزیں ہیں۔ اس ملک میں رہنا ہے
تو مذہب کو محض انفرادی اور پرائیویٹ سمجھو اور اس کو افراد تک ہی محدود رکھو۔
سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو کوئی دوسری علیحدہ قوم تصور نہ کرو اور اکثریت میں
مدغم ہو جاؤ۔

مولانا کی زمین و آسمان

مولانا نے فرمایا ہے کہ میں نے لفظ ملت اپنی تقریر میں استعمال نہیں کیا۔
میں ملت کو وطنی قوم سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق
ہے۔ گویا اگر قوم زمین ہے تو ملت بمنزلہ آسمان ہے لیکن معناً اور عملاً آپ
نے ملت کی اس ملک میں کوئی حیثیت نہیں چھوڑی اور اٹھ کر دوسرے مسلمانوں کو یہ
دعوت فرمادیا ہے کہ ملکہ و سیاست کے اعتبار سے اکثریت میں جذب ہو جاؤ قوم
تو میرٹ کو آسمان بناؤ۔ دین فطرت، زمین بنتا ہے تو بننے دو۔

مولانا نے یہ فرض کر کے کہ مجھے قوم اور ملت کے معنی میں فرق معلوم نہیں
اور شعر لکھنے سے پہلے جہاں میں نے مولانا کی تقریر کی اخباری رپورٹ کی
تحقیق نہ کی وہاں قافوس کی درقی گروانی بھی نہ کر سکا، مجھے زبان عربی سے
بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ یہ طعنہ سرانگھوں پر، لیکن کیا اچھا ہوتا اگر میری
خطر نہیں تو عاتقہ المسلمین کی خاطر قافوس سے گزر کر قرآن حکیم کی طرف رجوع کر

یتے اور اس خطرناک اور غیر اسلامی نظریہ کو مسلمانوں کے سامنے رکھنے سے
میشتر خدائے پاک کی نازل کردہ وحی سے بھی استنشاء فرماتے۔ مجھے تسلیم ہے

کہ میں عالم دین نہیں نہ عربی زبان کا ادیب۔
تقدیر جزو و حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا
نقیبہ شہر قاروں ہے لغت اسے حجازی کا

قافوس اور قرآن پاک

لیکن آپ کو کون سی چیز مانع آئی کہ آپ نے صرف قافوس پر گفتگو کی کیا
قرآن پاک میں سینکڑوں جگہ لفظ قوم استعمال نہیں ہوا؟ کیا قرآن میں ملت کا لفظ متعدد
بار نہیں آیا؟ آیات قرآن میں قوم و ملت سے کیا مراد ہے اور کیا جماعت محمدیہ
کے لئے ان الفاظ کے علاوہ لفظ امت بھی آیا ہے یا نہیں؟ کیا ان الفاظ کے
معانی میں اس قدر اختلاف ہے کہ ایک ہی قوم اس اختلاف معانی کی بنا پر ایسی
مختلف حیثیتیں رکھے کہ دینی یا شرعی اعتبار سے تو وہ لواہمیں الہیہ کی پابند ہو اور
ملکی و وطنی اعتبار سے کسی ایسے دستور العمل کی پابند ہو جو ملی دستور العمل سے
مختلف بھی ہو سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر مولانا قرآن سے استنشاء کرتے تو اس مسئلہ کا
حل خود بخود ان کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ آپ نے الفاظ کی جو لغت بیان فرمائی
وہ بہت حد تک درست ہے۔ قوم کے معنی جماعت الرجال فی الاصل دون النساء
ہے۔ گویا لغوی اعتبار سے عورتیں قوم میں شامل نہیں۔ لیکن قرآن حکیم میں جہاں

قوم موسیٰ و قوم عاد کے الفاظ آئے ہیں۔ وہاں ظاہر ہے کہ عورتیں اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ ملت کے معنی بھی دین و شریعت کے ہیں لیکن سوال ان دونوں لفظوں کے لغوی معانی کے فرق کا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان۔

اولاً اجتماعی اعتبار سے واحد و متحد اور معرف جماعت میں جوئی ملک یا رنگ و بستان کے مقتضیات کے ماتحت اپنی ملی وحدت چھوڑ کر کسی اور نظام قانون کے ماتحت کوئی اور مہیت اجتماعیہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔

ثانیاً کیا ان معنوں میں بھی قرآن حکیم نے اپنی آیات کو کہیں لفظ قوم سے تعبیر کیا ہے؟ یا صرف لفظ ملت یا امت ہی سے پکارا ہے؟ ثاثاً اس ضمن میں وحی الہی کی دعوت کس لفظ کے ساتھ ہے۔ کیا یہ کسی آیت قرآنی میں آیا ہے کہ اے لوگو! یا اے مومنو! قوم مسلم میں شامل ہو جاؤ یا اس کا اتباع کرو یا یہ دعوت صرف ملت کے اتباع اور امت میں شمولیت کی ہے۔

قرآن کریم میں ملت کا مفہوم

جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں قرآن حکیم میں جہاں جہاں اتباع و شرکت کی دعوت ہے وہاں صرف لفظ ملت یا امت وارد ہوا ہے۔ کسی خاص قوم کے اتباع یا اس میں شرکت کی دعوت نہیں۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:-

وَمِنْ أَحْسَنِ دِينٍ أَمَرَ أَسْلَمَ دِينُ اللَّهِ وَهُوَ أَحْسَنُ دِينٍ
مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا دَاتَبَعْنِي مِلَّةَ أَبِي إِبْرَاهِيمَ فَاتَّبِعُوا
مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا۔

اور یہ اتباع و اطاعت کی دعوت اس لئے ہے کہ ملت نام ہے ایک دین کا ایک شرح و منہاج کا۔

قوم چنانکہ کوئی شرع و دین نہیں ہے۔ اس لئے اس کی طرف دعوت اور اس سے تمسک کی ترغیب عبث تھی۔ کوئی گروہ ہو، خواہ وہ قبیلہ کا ہو، نسل کا ہو، واکووں کا ہو، تاجروں کا ہو، ایک شہر والوں کا ہو، جغرافیائی اعتبار سے ایک ملک یا وطن والوں کا ہو، وہ محض گروہ ہے۔ رجال کا یا انسانوں کا، وحی الہی یا نبی کے نقطہ خیال سے ابھی وہ گروہ ہدایت یافتہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ وحی یا نبی اس گروہ میں آئے تو وہ اس کا پہلا مخاطب ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی طرف منسوب بھی ہوتا ہے۔ قوم نوح، قوم موسیٰ، قوم لوط، لیکن اگر اسی گروہ کا مقتدا کوئی بادشاہ یا سردار ہو تو وہ اس کی طرف بھی منسوب ہوگا۔ مثلاً قوم عاد، قوم فرعون۔ اگر ایک ملک میں دو گروہ اکٹھے ہو جائیں اور اگر وہ متضاد قسم کے رہنماؤں کے گروہ ہوں تو وہ دونوں سے منسوب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً جہاں قوم موسیٰ تھی وہاں قوم فرعون بھی تھی۔ قتالہ الصلاد عن قوم نصر عود انتہ موسیٰ و قومہ۔

لیکن ہر مقام پر جہاں قوم کہا گیا وہاں وہ گروہ مخاطب تھا جو ابھی ہدایت یافتہ اور غیر ہدایت یافتہ سب افراد پر مشتمل تھا۔ جو افراد پیغمبر کی متابعت میں آئے گئے توحید تسلیم کرتے گئے، وہ اسی پیغمبر کی ملت میں آگئے۔ اس کے دین میں آگئے یا واضح تر معنوں میں مسلم ہو گئے۔ یاد رہے کہ دین اور ملت کفار کی بھی ہوتی ہے۔ الخ توحید ملة قوم لا یؤمنون باللہ۔ ایک قوم کی ایک ملت یا اس کا منہاج تو ہو سکتا ہے لیکن ملت کی قوم کہیں نہیں آیا۔ اس کا مفہوم یہ

ہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن میں ایسے افراد کو جو مختلف اقوام اور مملکتوں سے نکل کر ملت ابراہیمی میں داخل ہو گئے۔ ان کو داخل ہونے کے بعد لفظ قوم سے تعبیر نہیں کیا بلکہ امت کے لفظ سے۔

بنی نوع آدم کی تقسیم

ان گزارشات سے میرا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں قرآن کریم میں مسلمانوں کے لئے امت کے سوا اور کوئی لفظ نہیں آیا۔ اگر کہیں آیا ہو، تو ارشاد فرمایئے۔ قوم رجال کی جماعت کا نام ہے اور یہ جماعت باعتبار قبیلہ، نسل، رنگ، زبان، وطن اور اخلاق ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن ملت سب جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنائے گی۔ گویا ملت یا امت مجاز ہے اقوام کی خود ان میں جذب نہیں ہو سکتی۔

عہد حاضر کے ہندوستان کے علماء کو حالاتِ زمانہ نے وہ باتیں کرنے اور دین کی ایسی تاویل کرنے پر مجبور کر دیا ہے، جو قرآن یا نبی امی کا منشا ہرگز نہ ہو سکتی تھی۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت ابراہیم سب سے پہلے پیغمبر تھے جن کی وحی میں قوموں نہیں اور وطنوں کو بالائے طاق رکھا گیا۔ بنی آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی۔ موجد و مشرک اس وقت سے لے کر وہی ملتیں دنیا میں ہیں، تیسری کوئی ملت نہیں۔ کعبۃ اللہ کے محافظ آج دعوت ابراہیمی اور دعوت اسماعیلی سے غافل ہو گئے۔ قوم اور قومیت کی ردا اڑھنے والوں کو اس ملت کے بانیوں کی وہ دُعا یاد نہ آئی، جو اللہ کے گھر کی بنیاد رکھتے وقت ان دونوں پیغمبروں نے کی۔ واذ یوسف ابراہیم انقوا

من البیت واسما عیل طربنا تقبل منا انک انت السميع العليم۔ ربنا واجعلنا مسلمینک ومن ذریتنا امة مسلمة لک۔

الکفرة ملت واحدة

کیا خدا کی بارگاہ سے امت مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش باقی تھی کہ آپ کی بیعت اجتماعی کا کوئی حصہ عربی، ایرانی، ہما فغانی، انگریزی، مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا ہے۔ امت مسلمہ کے مقابل میں تو صرف ایک ہی ملت ہے اور وہ الکفر ملت واحدہ کی ہے۔

امت مسلمہ جس دین فطرت کی حامل ہے اس کا نام دینِ قییم ہے۔ دینِ قییم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفہ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی مقوم ہے اس گروہ کے امور معاشی و معادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کر دے۔ بالفاظِ دیگر یہ کہ قرآن کی رو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم، دین اسلام سے ہی تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نامعقول و مردود ہے۔ ایک اور لطیفہ بھی مسلمانوں کے لئے قابلِ غور ہے کہ اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابلِ قدر تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقارب اور ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پر خاش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک ہمہ گیر معمولی ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت ابو جہل اور ابولہب کو اپنا بنائے رکھا اور ان کی دُعا کوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ

قومیت قائم رکھی۔ اگر اسلام سے مطلق آزادی مراد تھی تو آزادی کا نصب العین
تو قریش مکہ کا بھی تھا۔ مگر افسوس آپ اس نکتہ پر غور نہیں
فرماتے کہ پیغمبر خدا کے نزدیک اسلام دینِ قیم، امت مسلمہ کی آزادی مقصود تھی ان
کو چھوڑنا، ان کو کسی دوسری قومیت اجتماعیہ کے تابع رکھ کر کوئی اور آزادی چاہنا
بے معنی تھا۔ ابو جہل اور ابولہب امت مسلمہ کو ہی آزادی سے چھوڑنا پھلتا نہیں دیکھ
سکتے تھے کہ بطور ممانعت ان سے نزاع درپیش آئی۔ محمد (فداہ اتھی واتی) کی قوم
آپ کی بعثت سے پہلے قوم تھی اور آزاد تھی لیکن جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت
بننے لگی، تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی متابعت میں آگئے وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے وہ سب
امت مسلمہ یا ملت محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے اب
ملک و نسب ان کا گرفتار ہو گیا ہے۔

کے کو پنجہ زد ملک و نسب! نہ داد نہ نکتہ دین عرب را
اگر قوم از وطن بوسے محمد نہ داد سے دعوت دین ابولہب را

مقام محمدی

حضور رسالت مآب کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابو جہل
یا کفار مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی محبت پرستی پر قائم رہو مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک
کی بنا پر جو تمہارے تمہارے درمیان موجود ہے، ایک وحدت عربیہ قائم کی جا
سکتی ہے۔ اگر حضور لغو و باطلہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ

ایک وطن دوست کی راہ ہوتی۔ لیکن بنی خرا زمان کی راہ نہ ہوتی۔ نبوت محمدیہ کی غایت
ان غایات پر ہے کہ ایک قومیت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس
قانون الہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہ الہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظ دیگر
یوں کہتے کہ بنی نوع انسان کی اقوام کو بادی وجود شعوب و قبائل اور الوان والسنہ کے
اختلافات کو تسلیم کر لینے کے ان کو ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زمان،
مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس
طرح اس پیکر خاکی کو وہ ملکوتی تحمل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے
ہم کنار رہتا ہے۔ یہ ہے نصب العین ملت اسلامیہ کا۔ اس کی بلند یوں تک پہنچنے تک
معلوم نہیں، حضرت انسان کو کتنی صدیاں لگیں، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوام عالم
کی باہمی مغایرت دور کرنے اور بادی وجود شعوبی، قبائلی، نسلی، لونی اور لسانی امتیازات
کے ان کو یک رنگ کرنے میں جو کام تیرہ سو سال میں کیا ہے وہ دیگر ادیان سے تین
ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔ یقین کیجئے کہ دین اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس
حیاتی اور نفسیاتی عمل ہے جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالم انسانی کے فکر و عمل
کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو جس کے سیاسی مفکرین کی جدت
طرازیوں سے مسخ کرنا عظیم عظیم ہے۔ بنی نوع انسان پر اور اس نبوت کی ہمہ گیری
پر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔

مولانا حسین احمد کے بیان کا وہ حصہ جس میں آپ نے مدبر احسان سے اس
بات کی تائید میں نص طلب کی ہے کہ ملت اسلامیہ شرف انسانی اور اخوت بشری پر مبنی
ہے بہت سے مسلمانوں کے لئے تعجب چیز ہوگا لیکن میرے لئے چنداں تعجب چیز نہیں۔

اس لئے کہ مصیبت کی طرح گمراہی بھی تنہا نہیں آتی۔ جب کسی مسلمان کے دل و دماغ پر وطنیت کا وہ نظریہ غالب آجائے جس کی دعوت مولانا دے رہے ہیں تو اسلام کی اساس میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ وطنیت سے قدر شاہانہ حرکت کرتے ہیں۔ اس خیال کی طرف کہ بنی نوع انسان اقوام میں اس طرح بٹے ہوئے ہیں کہ ان کا نوعی اتحاد امکان سے خارج ہے اور دوسری گمراہی جو وطنیت سے ادیان کی اضافیت کی لعنت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی یہ تصور کہ ہر ملک کا دین اس ملک کے لئے خاص ہے اور دوسری اقوام کے طبائع کے موافق نہیں۔ اس تیسری گمراہی کا نتیجہ سوائے لادینی اور دہریت کے اور کچھ نہیں۔

انسان کا نصب العین

یہ نفسیاتی تجزیہ ہے اس تیرہ بخت انسان کا جو اس روحانی جہاد میں گرفتار ہو جائے باقی رہائش کا معاملہ میں سمجھتا ہوں کہ تمام قرآن ہی اس کے لئے نص ہے۔ لفاظ شرف انسانی کے متعلق کسی کو دھوکا نہیں ہونا چاہئے۔ اسلامیت میں ان سے مراد وہ حقیقت کبریٰ ہے جو حضرت انسان کے قلب و ضمیر میں ودیعت کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اس کی تقویم فطرۃ اللہ ہے اور اس شرف کا غیر ممنون یعنی غیر منقطع ہونا منحصر ہے۔ اس تڑپ پر جو توحید الہی کے لئے اس کے رگ و ریشے میں مرکوز ہے انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو۔ ایک لانتنا ہی سلسلہ باہم آدیز شوق کا، خونریزیوں کا اور غماز جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالم بشری میں ایک ایسی امت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن اور سلامتی پر موقوف ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو

سکتی ہے بشرطیکہ توحید الہی کو انسانی فکر و عمل میں حسبِ منشاء بنیو مشہور کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبیر کا کرشمہ نہ سمجھئے، بلکہ یہ رحمتہ العالمین کی ایک شان ہے کہ اقوام بشری کو ان کے تمام خود رمانعہ نفوتوں اور فضیلتوں سے پاک کر کے ایک ایسی امت کی تخلیق کی جائے جس کو امت مسلمہ کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر شہادۂ علی الناس کا خدائی ارشاد صادق آ سکے۔

قادیانی افکار کا منبع

حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریہ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں، افکار خاتمیت کا۔ نظریہ وطنیت کے حامی، بالفاظ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امت مسلمہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وقت کی مجبور یوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانون الہی ابدالاباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے، کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایک ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوت محمدیہ کے کمال اکمل ہونے سے انکار ہے بعینہ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی امت مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کمال ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔ بظاہر نظریہ وطنیت سیاسی نظریہ ہے اور قادیانی "انکار خاتمیت" الہیات کا ایک مسئلہ ہے لیکن ان دونوں میں ایک گہرا معنوی تعلق ہے جس کی توضیح صرف اسی وقت ہو سکے گی جب کوئی دقیق النظر مسلمان مؤرخ ہندی مسلمان اور

بالخصوص ان کے بعض لفظ ہر فرقہ کے دینی افکار کی تازہ سیخ مرتب کرے گا۔
 اس مضمون کو خاقانی کے ان دو شعروں پر ختم کرتا ہوں جن میں
 خدا تمہارا گھر ہے اپنے ان معاصر حکماء سے اسلام کو مخاطب کیا ہے، جو
 حق تعالیٰ اسلام کو یونانی فلسفہ کی روشنی میں بیان کرنا فضل و کمال کی انتہا سمجھتے تھے۔
 غور سے سے معنوی تغیر کے ساتھ یہ شعرا آج کل کے مسلمان سیاسی مفکرین پر بھی صادق
 آتے ہیں۔

مرکب دین کر زادہ عرب است داغ یونانی بر کفل منہبید
 مشتے اطفال نو تعلم را لوح ادبار و بر بعل منہبید
 مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار
 کا خاتمہ کرنا ہمارا فرض ہے اور اس آزادی سے ہمارا مقصد یہی نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں
 بلکہ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے
 مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں
 پر ہوں، جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو ٹھاکر دوسرے باطل کو قائم
 کرنا چر معنی دار ہے؟

ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالسلام بن جائے
 لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دار کفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی
 بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادی وطن پر ہزار مرتبہ لعنت سمجھتا ہے۔ ایسی آزادی
 کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ
 حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔

چودھویں صدی ہجری

کے عظیم عارف و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) الشاہ امام احمد رضا خان بریلوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اعظم شیخ الاسلام و المسلمین حضرت الحاج
شیخ ضیاء الدین احمد مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی حیات مبارکہ
پر ایک مستند اور جامع دستاویز

ضیاء الدین

کنیہ لوی

مرتبہ

حافظ محمد ظاہر رضا قادری زید مجدہ

نہایت خوبصورت ڈائل وار جلد — صفحات ۶۵۶

رضاء دارالاشاعت لاہور پاکستان